مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی فن اور شخصیت

ڈاکٹر سیدہ مصباح رضوی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور

Abstract

"Marsya" is one of the most important genre of urdu poetry. This genre of poetry has great names like Anees and Dabeer. In this article, Mirza Muhammad Jafar Auj Lakhnavi's Marsya writting has been discussed. He was very much interested in Marsya, specially because of his family background.

مرزا اوج لکھنوی ایک قادرالکلام مرثیہ نگار تھے۔ ان کی پہلی خوش قسمتی تھی کہ علم و فضل اور شاعری کے حوالے سے بہترین خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ملا اہلی شیرازی ان کے اسلاف میں سے تھے۔ جو فارسی کے مستند شاعر تھے اور مثنوی ''سحر الحلال'' کے حوالے سے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ مرزا دبیر کے فرزند ہونے کی وجہ سے مرزا اوج اپنے والد کے اوصاف و کمالات اور شاعرانہ صلاحیتوں کے امین اور وارث بھی تھے۔ مرزا اوج کی دوسری بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ لکھنو میں ایسے دور میں پیدا ہوئے جب مرثیہ ایک توانا روایت کے ساتھ لکھنو میں کامیابی اور مقبولیت کے آخری زینوں پر تھا۔ لکھنو کی فضا میں مرثیہ پوری طرح رچا بسا ہوا تھا۔ ایسے علمی و ادبی پس منظر اور لکھنو کی بھرپور اور اعلیٰ روایت مرثیہ کی فضا سے مرزا اوج نے کماحقہ فائدہ اٹھایا اور مرثیہ گوئی میں نام اور مقام پانے کے حقدار ٹھہرے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ انیس و دبیر کے بعد اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا اور اپنی شاعری کے سبب ایک مخصوص رجحان کو فروغ دینے میں مدد کی کہ جس کے سلسلے جدید مرثیہ نگاری کی بنیادوں سے جڑے ہوئے ہیں۔

مرزا اوج لکھنوی کا شمار ان مرثیہ نگاروں میں ہوتا کہ جن کی طرف چند ایک مرثیہ شناسوں نے بھرپور توجہ دی ہے۔ مرزا اوج کا مختصر ذکر مرثیہ شناسی کی کئی کتابوں میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک تفصیلی مقالہ بھی ہے جسے آغا سکندر لکھنوی نے ''مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی۔ حیات اور ادبی کارنامے'' کے عنوان سے لکھ کر لکھنو یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالے کو بعد ازاں شائع کروا دیا گیا۔ اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے مرزا اوج لکھنوی کی حیات اور ادبی کارناموں کی نادر تفاصیل سامنے آئیں۔ اس مضمون میں کتابی صورت میں دستیاب مواد کی مدد سے مرزا اوج پر ہونے والے تنقیدی اور تحقیقی کام کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ مرزا اوج لکھنوی کی شخصیت اور

ادبی حیثیت کا تعین کرنے میں مدد مل سکے۔

سوانح:

''دبستان دبیر'' میں ڈاکٹر ذاکر فاروقی، مرزا اوج کے سوانح کی تفصیلات دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مرزا محمد جعفر نام، اوجؔ تخلص، مرزا دبیر کے خلف اکبر اور سید انشاء کے نواسے تھے۔ ۶ جمادی الاول ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۵۳ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مرزا دبیر کے شاگرد انگر مرحوم سے پائی، فارسی شیخ بہادر حسین وحید سے اور عربی مولوی کمال الدین اور مولانا سید تقی سے پڑھی، ایک بنگالی ڈاکٹر نویں چندر سے اردو میں ایلو پیتھک ڈاکٹری سیکھی، لیکن اسے کبھی ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ دو ہزار روپے سالانہ وقف باندی بیگم صاحبہ پٹنہ سے ملتے تھے اور بتیس روپے ماہوار باقر سوداگر کے امام باڑہ (واقع لکھنو) سے آمدنی تھی۔ اسی پر بسر اوقات رہی اور عمر کی چھیاسٹھ بہاریں دیکھ کر ۲۵ جمادی الاخر ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۸۔ اپریل ۱۹۱۷ء کو رہگزائے عالم بقا ہوئے، کوچہ مرزا دبیر میں باپ کے پہلو میں دفن ہیں۔''[1]

مرزا اوج کے بارے میں سوانحی تفصیلات کے حوالے سے سب سے اہم ماخذ ''مرزا محمد اوج لکھنوی، حیات اور ادبی کارنامے'' کے نام سے ڈاکٹر سید سکندر آغا نے تحریر کی۔ انھوں نے سوانح کی تفصیلات میں مرزا اوج کے آباو اجداد، مرزا غلام حسین کے اشتہادی تفصیلات وغیرہ کا ذکر بھی کافی وضاحت کے ساتھ کیا۔ اس کتاب سے پہلے ہونے والی تحقیق کے علاوہ جو نئی باتیں اس کتاب میں شامل ہوئیں ان کے سبب مرزا اوج لکھنوی کی زندگی کے کئی پہلو نمایاں ہو کر سامنے آئے۔ جن سے ان کا سوانحی خاکہ بہت حد تک مکمل ہو گیا۔ آغا سکندر نے مرزا اوج کی شادی کے متعلق لکھا کہ مرزا اوج کے پوتے مرزا محمد صادق کے پاس جو خاندانی دستاویزات اور دیگر کاغذات موجود ہیں اس میں ایک دعوت نامہ بھی ہے۔ مرزا دبیر نے اوج کی شادی کی لیے ایک منظوم دعوت نامہ لکھا اور اعزا وروسائے شہر کو مدعو کیا۔ سید سکندر آغا نے اس منظوم دعوت نامے کو اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے۔ اس دعوت نامے کے مطابق:

'اوج کی شادی شب جمعہ ۱۲ جمادی الاخر ۱۲۸۲ھ/ نومبر ۱۸۶۵ء کو ہوئی۔ اس وقت مرزا اوج کی عمر صرف ۱۳ سال تھی۔'[2]

مرزا اوج کی شادی ایک صاحب حیثیت امیر خاندان میں ہوئی۔ آغا سکندر نے ثابت حسین لکھنوی کیا ایک بیان بغیر حوالے کے ایک بیان اپنی کتاب میں نقل کیا اور اس پر اعتراض بھی کیا۔ لکھتے ہیں کہ ثابت حسین لکھنوی نے مرزا اوج کی شادی کے بارے میں ایک مبہم بیان دیا کہ مرزا اوج نے عنفوان شباب میں ایک صاحبہ ثروت بیگم سے عقد کر لیا۔

''اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس عقد میں ان کے پدر بزرگوار کی مرضی شامل نہ تھی۔''[۳]

مرزا اوج لکھنوی کے ہاں ایک بیٹا اور ایک بیٹی متولد ہوئے۔ بیٹی کے متعلق معلومات محدود ہیں۔ آغا سکندر نے محض یہ لکھ کر بات ختم کر دی کہ

''بیٹی کی شادی نواب حسن علی خاں عرف اچھے صاحب سے ہوئی تھی''[۴]

جبکہ مرزا اوج کے بیٹے مرزا محمد طاہر رفیع پر چند ضروری معلومات اور نمونہ کلام کو کتاب میں جگہ دی۔ مرزا اوج کے بیٹے کا نام مرزا محمد طاہر رفیع ہے۔ مرزا محمد طاہر اپنے مخصوص ماحول کے زیر اثر کم عمری میں ہی والد کے ساتھ مجالس میں جاتے اور پیش خوانی کرنے لگے۔ دادا نے خوش ہو کر رفیع تخلص تجویز کیا۔ مرزا محمد طاہر رفیع نے اپنی خاندانی روایات کو ذمہ داری سے آگے بڑھایا۔

مرزا اوج عادات وخصائل:

آغا سکندر نے مرزا اوج کے عادات وخصائل کا ذکر واقعات اور احباب کی آرا کی مدد سے نہایت تفصیل سے کیا ہے ان معلومات کی روشنی میں مرزا اوج بہترین کردار اور شخصیت کے مالک انسان تھے۔ خوش مزاجی، دوستانہ مراسم، صاف گوئی، سخاوت، مہمان نوازی، بزرگانہ شفقت، جذبہ خودداری، استغنا، مذہبیت، سادگی، جذبہ ایثار وقربانی، وضع داری، بذلہ سنجی اور ذہانت ان کی نمایاں صفات تھیں۔ دوسرے ناقدین نے بھی مرزا اوج کے کردار وشخصیت کے حوالے سے ایسی ہی باتوں کا ذکر کیا ہے۔ آغا سکندر نے ان کی صلح پسند طبیعت کے بارے میں یہاں تک لکھا کہ مرزا اوج نے:

''لکھنو میں انیس ودبیر کے معتقدین اور مقلدین کی جو کشمکیں چل رہی تھیں ان کو ختم کر دیا۔''[۵]

مرزا اوج کی طبیعت میں سادگی اور استغنا کی صفت نمایاں تھی۔ وہ خود کو دنیاداری کے جھمیلوں سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے شہرت سے بھی بے نیازی برتی۔ خود کو ایسے معرکوں سے دور رکھا جو سستی شہرت کے آسان راستے تھے۔ ان کے مزاج کی سادگی، استغنا کی وجہ سے شہرت سے بے نیازی کا ذکر ناقدین نے بالخصوص کیا لیکن سید عاشور کاظمی کی رائے کے مطابق مرزا اوج باکمال شاعر ہونے کے باوجود اگر معروف نہ ہو سکے تو اس کی ایک وجہ ان کے مزاج کا روکھا پن ہے اور دوسری انیسیوں اور دبیریوں کی گروہ بندی اور باہمی چپلقش تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''مرزا اوج کے ساتھ جو انصاف نہیں ہوا اس کی ایک وجہ تو ان کا اپنا رویہ کہ ہم عصر تخلیق کاروں کو ساتھ لے کر چلنے کے بجائے انھیں اس طرح ڈانٹنا شروع کر دیا۔ جیسے ان کے عہد کے نابالغ بچے چٹائیوں پر بیٹھے ماسٹر جی کی تختیاں کھاتے تھے............مرزا اوج کے ساتھ جو سلوک ہوا اس کی دوسری وجہ وہ گروہ بندی اور چپقلش کے منفی رویے ہیں جو انیس ودبیر کے چاہنے والے بڑے

خلوص اور نیک نیتی سے ایک دوسرے کے خلاف رکھتے تھے۔''۶

عاشور کاظمی نے مرزا اوج لکھنوی پر تین، چار صفحے تعارف میں لکھے اور ان میں بار ہا ان کے درشت لہجے کا ذکر کیا۔ اپنی بات کی سند کے لیے انہوں نے کسی کتاب یا نقاد کی رائے کا سہارا نہیں لیا بلکہ دو، چار، اشعار ایسے پیش کیے جن میں اپنے موضوع کی وجہ سے اوج لکھنوی کا لہجہ ذرا کرخت ہے مگر یہ ثبوت ہرگز کافی نہیں۔ عاشور کاظمی کی طرف سے کیے جانے والے ایک اعتراض کی تفصیل یہ ہے کہ مرثیے میں تغزل کے رنگ کو نمایاں کرنے والے مرثیہ گویوں کو مرزا اوج پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کے اسی موضوع کے اشعار کو بنیاد بنا کر عاشور کاظمی نے یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ مرزا اوج اپنے ہم عصروں کے ساتھ سختی سے پیش آتے، اشعار یہ ہیں:

کوئی سنے گل و بلبل کی داستاں کب تک — محاوروں کی خوش آمد چنیں چناں کب تک
یہ سرد بستروں کے ساتھ گرمیاں کب تک — غلط نمائی تخیل کا بیاں کب تک
ردیف قافیہ کیا شے ہے جانتے ہی نہیں
فن ان کی طرح سے لا شے ہے مانتے ہی نہیں

یہ شعر ایک نقطہ نظر ہے اور شاعر نے اسی لہجے کو اپنایا ہے جو اس دور میں روا تھا۔ ہر بڑے شاعر کے ہاں سے با آسانی ایسے یا اس سے بھی سخت لہجے کے شعر تلاش کیے جا سکتے تو کیا درشت گوئی کا لیبل سبھی پر لگایا جا سکتا ہے؟ یہ طریقہ تنقید درست نہیں ہے کیونکہ رائے قائم کرنے کے لیے محض ایک دو اشعار پر اکتفا کرنا گمراہی کا سبب بنتا ہے۔ ضروری ہے کہ شاعر کے تمام کلام کا بھرپور اور تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ شاعر نے اپنے بارے میں کن خیالات کا اظہار بار بار کیا ہے۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ اسکے دوست احباب اور ہم عصران اشعار ہر کس رویے اور ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

پروفیسر مسعود حسن ادیب نے اس ضمن میں بڑے پتے کی بات کی ہے۔

''ہر شاعر کے ہر شعر سے اس کی سیرت کا استدلال کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ لیکن جن مضامین کو کوئی شاعر بار بار نظم کرتا ہو ان سے اس کے خیالات کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔''۷

اوؔج اپنا کلام بھرے مجمعے میں سنایا کرتے تھے اگر کوئی بات اپنی طبیعت اور عمل کے خلاف بیان کرئے تو لوگ انگلی اٹھاتے اور اوؔج ان کی تنقید سے نہ بچ پاتے۔ مگر ایسا کوئی واقع مرثیہ شناسوں کے ہاں نہیں ملتا۔ تقریباً تمام ناقدین نے ان کے سیرت و کردار کی تعریف کی ہے۔ لالہ سری رام، مرزا اوج کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''نہایت خلیق، خوش مزاج، زندہ دل بزرگ ہیں۔''۸

پر بقول غالبؔ ''ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے'' مرزا اوج کو ان کے زمانے میں چند بدظنوں نے برا بھلا بھی کہا ان کی ہجو بھی لکھی اور نقلیں بھی اتاریں۔ مگر اعلیٰ کردار کا پتا ایسی باتوں کے ردعمل سے ہی چلتا ہے اور

بقول سید آغا مہدی:

''مرزا صاحب نے نہ کسی ہجو کا خود جواب دیا نہ کسی شاگرد کو اجازت دی کہ وہ دفاع کرے۔'' ۹

مرزا اوج خود بھی تحمل پسند تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے زیر نگیں تربیت پانے والے بھی جبر و برداشت کی طاقت رکھتے ہوں۔ مرزا اوج صاحبِ علم تھے اور صاحب علم حضرات کی قدر دانی کرنا جانتے تھے۔ اپنے ہم عصروں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے شاگردں سے بھی محبت، دوستی اور مہر آمیز رویے سے پیش آتے تھے۔ مرزا اوج کا اپنے شاگردوں کے ساتھ کیسا رویہ تھا اس بارے میں ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں کہ:

''مرزا اوج اپنے شاگردوں سے بڑی محبت کرتے تھے اور ان کا دل بڑھانا اپنا فرض تصور کرتے تھے۔ خدا نے ان کو شاگرد بھی ایک سے ایک اچھے عنایت کئے...... دور حاضر کی مرثیہ نگاری بیشتر ان کے شاگردوں کی مرہونِ کرم ہے۔'' ۱۰

مرزا اوج جس خاندانی روایت کے امین تھے یہ خودسری نہ انہیں زیب دیتی تھی نہ ان کے منصب کے مطابق تھی۔ دوسری بات شعر کو بنیاد بنا کر ایسی رائے دینا، قاری کے اطمینان کا باعث نہیں۔ مرزا اوج کی ادبی حیثیت اور ان کے تلامذہ کی کثیر تعداد بھی اس رائے کے غلط ہونے کی دلیل ہے۔ مرزا اوج اپنی کسرِ نفسی اور قناعت پسند طبیعت کے باعث شہرت کے معرکوں سے دور رہے عبدالروف عروج اسے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ان کی شہرت محدود ہونے میں ان کی قناعت پسندی کو زیادہ دخل ہے۔ وہ اپنے پیچھے تلامذہ کا ایک وسیع گروہ رکھتے تھے۔ چاہتے تو ان کی شہرت کے آگے خاندان انیس کا چراغ گل ہو جاتا۔ اس دور میں جب کہ مرثیہ گو انیس، رئیس اور دبیر کے نام پر مختلف گروہوں میں بٹ گئے تھے، اوج نے غیر جانبداری مناسب سمجھی اور ہر معرکہ سے خود کو دور رکھا۔ اسی صلح مشربی اور عافیت نشینی نے ان کے تمام شعری محاسن پر پردہ ڈال دیا۔'' ۱۱

یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ مرزا اوج کو شہرت کے حصول میں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ وہ اک گوشہ نشین صوفی کی طرح اپنا کام کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک معرکہ آرائی میں وقت گنوانے سے بہتر تھا کہ مختلف ذرائع سے علم حاصل کیا جائے۔ کہ جو ان کی ذات اور قلم دونوں کو سنوار دے۔ مرزا اوج کی علمی و ادبی استعداد کا ذکر ان کے تمام ناقدین نے کیا۔ ان کی تصانیف علمی و ادبی تحریروں نے ان کے علمی تبحر کا سکہ بٹھا دیا۔ سید عاشور کاظمی نے ان کی علمی استعداد کو ثابت کرنے کے لئے ان کی ایک خصوصیت کا ذکر اس طرح سے کیا کہ:

''اس عہد میں انگریزی کا جو لٹریچر ہندوستان پہنچتا تھا۔ مرزا اوج اس کا ترجمہ مرزا ارسوا سے سنتے تھے تا کہ وہ اس سے باخبر رہیں کہ انگریزی ادب میں کیا ہو رہا ہے۔ مرثیہ نگاروں کی تاریخ میں مرزا اوج واحد مرثیہ نگار تھے، جو یورپ کے ادب سے واقف رہنا چاہتے تھے۔'' ۱۲

مرثیہ گوئی کا آغاز اور تخلص:

اپنے زمانے کے رجحان اور میلان کے مطابق مرزا اوج کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کی تربیت کا آغاز بچپن سے ہی ہو گیا ہوگا۔ ذاکر فاروقی لکھتے ہیں کہ مرزا اوج نے پہلا مرثیہ محض سولہ سال کی عمر میں کہا جس کا مطلع یہ ہے:

''اس مرثیہ میں عید و محرم کا حال ہے'' ۱۳؎

آغا سکندر نے اسی مرثیے کے دو اور بند اپنی کتاب میں نقل کر دیئے ہیں۔ آغا سکندر نے خبیر لکھنوی کے حوالے سے لکھا کہ مرزا اوج کا تخلص کس طرح طے پایا:

''جناب مفتی میر عباس صاحب .... نے اوج اور رفیع تجویز فرما کر مرزا دبیر صاحب کو حق انتخاب عطا فرمایا۔ مرزا صاحب نے استخارہ پر بنا کر کے اوج تخلص رکھا۔ ۱۴؎

مجالس:

مرثیہ گوئی مرزا اوج کے مزاج کا حصہ تھی اور ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ پورا گھرانہ اور شہر کا ماحول شعر گوئی کے خوشبوؤں میں رچا بسا ہوا تھا۔ لہذا مرزا اوج نے اوائل عمری ہی مرثیہ گوئی کی تربیت لینا شروع کر دی تھی۔ مرزا دبیر کی وفات کے بعد والد کی دی ہوئی تعلیم اور مشق کا نتیجہ سامنے آیا۔ مرزا اوج نے والد کی وفات پر مجالس میں مرثیہ خوانی کی اور بعد میں ان تمام جگہوں پر جانے لگے جہاں والد محترم مرثیہ خوانی کیا کرتے تھے کیونکہ مرزا دبیر کے بعد ان کے معیار اور انداز مرثیہ خوانی کا حق مرزا اوج سے بڑھ کر اور کون ادا کر سکتا تھا۔ جس وقت مرزا دبیر کا انتقال ہوا اس وقت مرزا اوج کی عمر تقریباً ۲۳ تیئس برس تھی۔ ''دبستان دبیر'' میں ذاکر فاروقی نے اودھ اخبار اور دیگر ذرائع کی مدد سے مرزا اوج کی مجالس کا حال لکھا۔ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرزا دبیر کی وفات پر پڑھی جانے والی مجالس میں ہی مرزا اوج کی دھاک جم چکی تھی۔ اودھ اخبار نے مرزا دبیر کی وفات کے بعد سوئم کی مجلس کے متعلق جو لکھا اسے دبستان دبیر میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا گیا کہ:

''مرزا اوج نے قریب دس بارہ رباعیوں کے حسب حال اپنے اور وفات پدر بزرگوار پڑھیں۔ کہرام پڑ گیا۔ عجائب مضامین عالی تھے............ تمام شہر کو ان کی مرثیہ گوئی میں جو شبہ تھا دفع اور رفع ہو گیا۔ برصغیر و کبیر کی زبان پر تھا کہ الولد سر' لابیہ'' ۱۵؎

اودھ اخبار کے اس بیان کا ایک حصہ توجہ طلب ہے کہ ان کی مرثیہ گوئی میں جو شبہ تھا رفع دفع ہو گیا۔ افضل حسین ثابت لکھنوی نے بھی اپنے بیان میں اسی قسم کے شبہ کو کچھ اس طرح سے رفع کیا ہے کہ نواب فیاض خان

''مرزا اوج کے کلام کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ نیا عزا خانہ اعلیٰ درجہ پر بنوایا............ حضرت اوج کو بلوا کر ایک عشرہ تک مجلسیں کر کے مرزا صاحب کو خوب سُنا اور ان منکروں کو سنوایا جو مرزا اوج کو ایک عاجز شاعر کہتے تھے۔'' ۱۶؎

ان دونوں بیانات سے یہ لگتا ہے کہ شاید حریفوں نے یہ مشہور کر دیا ہو کہ مرزا اوج کو مرثیے مرزا دبیر لکھ کر دیتے تھے۔ کیونکہ ایسی بہت سے روایات مشہور تھیں کہ جن میں باپ بیٹے کو اور استاد شاگرد کو مرثیے لکھ لکھ کر دیتے رہے۔ مثلاً میر خلیق کے بارے میں بھی مشہور تھا کہ وہ میر انیسؔ کو مرثیے لکھ کر دیتے تھے۔ لیکن وہ وقت بھی آجاتا ہے جب ایسے واقعات کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ والد کی وفات کے بعد مجالس کا تواتر تعداد اور مرثیوں کی فکری اور فنی بلندی نے ثابت کر دیا کہ مرزا اوؔج قادر الکلام مرثیہ گو ہیں۔ اور ہر طرح کے شکوک دم توڑ گئے۔

مرزا اوج کی دو ایک مجالس کا ذکر تو ''دبستان دبیر'' میں مرزا دبیر کے سوئم اور چہلم کی مجالس کے حوالے سے آیا ہے مگر مرزا اوج کی مجالس کی زیادہ تر تفصیلات کا ذکر آغا سکندر نے کیا۔ انھوں نے مرزا دبیر کے سوئم اور چہلم پر پڑھی جانے والی مجالس کے علاوہ ان کی دیگر مجالس کی تفصیل بھی درج کی۔

ان کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ امام باڑہ سبطین میں اربعین کی مجلس پڑھی۔ جہاں حضرت واجد علی شاہ اختر شاہ اودھ مدفون ہیں۔
۲۔ فیاض علی خاں بہادر کے یہاں مجلس پڑھتے۔
۳۔ نواب زادہ حاجی سید دلدار علی خاں رئیس (صوبہ بہار) کے یہاں مجلس پڑھنے جاتے تھے۔
۴۔ سادات بارہہ اور سادات امروہہ میں کئی سال تک ایک ایک عشرہ پڑھنے گئے۔
۵۔ درواغہ میر واجد علی تسخیرؔ کے میلاد میں پڑھا۔
۶۔ مرزا عابد علی صاحب کے ہاں، لکھنو میں مجلس پڑھی۔
۷۔ مالک مطبع اثنا عشری نواب وارث علی خاں کے ہاں، لکھنو میں مجلس پڑھی۔
۸۔ ایک سالانہ مجلس اپنے شاگرد رشید سید سرفراز حسین خبیر کے ہاں لکھنو میں پڑھتے رہے۔

آغا سکندر لکھتے ہیں کہ:

> ''حقیقت یہ ہے کہ مرزا دبیر جن مجالس میں پڑھتے تھے ان کے انتقال کے بعد ان کی مجالس میں مرزا اوج نے خود پڑھ کر ان کی تاریخی نوعیت کو برقرار رکھا''۔[۱۷]

مرزا اوج نے حیدر آباد، بہار، کلکتہ، عظیم آباد، جونپور، آگرہ، حسین گنج، ضلع سارن، زید پور ضلع بارہ بنکی، جرول ضلع بہرائچ، پنڈزاول ضلع بلند کے شہروں میں بھی مرثیہ گوئی کے لئے تشریف لے کر گئے۔ آغا سکندر لکھتے ہیں کہ:

> ''مرزا صاحب نے جو سفر اپنی زندگی میں کئے وہ سیر و سیاحت کی غرض سے نہیں بلکہ ذکر حسینؑ کے لئے کئے۔''[۱۸]

طرز خواندگی:

مرثیہ درحقیقت سننے کی چیز ہے۔ اسی لیے مرثیہ خوانی کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی اور اس کی تربیت

کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ مرزا دبیرؔ کے انداز مرثیہ خوانی کے دھوم چاروں طرف تھی۔ وہ لفظوں کی ادائیگی سے آنکھوں کے سامنے مناظر کو زندہ کر دینے کی قدرت رکھتے تھے۔ مرزا اوج نے اپنی اس موروثی اور خاندانی صفت کو اپنی مشق اور اندز سے قائم اور جاری رکھا۔ طرز خواندگی کے متعلق آغا سکندر نے ثابت لکھنوی کے حوالے سے لکھا کہ مرزا اوج کے پڑھنے کا انداز بالکل سادہ تھا، مثل اپنے والد مرحوم کے۔ انداز مرثیہ خوانی ایسا تھا جیسے باتیں کر رہے ہوں، جس طرح باتیں کرتے تھے اسی طرح پڑھتے تھے، مرزا صادق نے بتایا کہ جس طرح ان کے پردادا منبر پر بیٹھ کر ''بتلانے'' کو عیب سمجھتے، اسی طرح مرزا اوج بھی اپنے باپ کے اصول کی سختی سے پابندی کرتے اور آنکھ اور ابرو کے اشاروں سے مرثیہ خوانی میں کام لیتے، مرزا اوج کی آواز میں اتنی طاقت تھی کہ دور بیٹھے سامعین بھی ان کے کلام کو آسانی سے سن کر محظوظ ہوتے۔

مرثیہ خوانی میں ہاتھوں، جسم کی جنبش اور اشاروں سے معانی مضمون ادا کرنے کی کوشش کو بتلانا کہتے ہیں۔ مرزا دبیر ''بتلانے'' کو عجیب سمجھتے تھے۔ مرزا دبیر زیادہ تر آواز کے مدوجزر سے کام لیتے تھے۔ کبھی کبھی چشم و آبرو کا سہارا لیتے مگر اسے بھی عام حد سے متجاوز نہ ہونے دیتے۔ مرزا اوج نے بھی طرز خواندگی میں والد محترم کی تقلید کی۔ اودھ اخبار نے جو خبر مرزا دبیر کی وفات کے بعد انکی مجلس سوئم کے حوالے سے چھاپی اس میں لکھا کہ سوئم کی مجلس میں مرزا اوج کا پڑھنا ایسا تھا جیسے مرزا دبیر پڑھ رہے ہوں:

''گویا مرزا دبیر............ پڑھ رہے تھے'' [۱۹]

تعداد کلام:

ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں:

''مرزا اوج نے مراثی............ کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا جو اشاعت کی نعمت سے محروم رہا، صرف چودہ مرثیے معراج الکلام میں شائع ہوئے۔'' [۲۰]

سید صفدر حسین لکھتے ہیں مرزا اوج نے:

''۷۵ سال کی عمر میں تقریباً سو مراثی تصنیف کئے جن میں سے ایک مجموعہ کلام ''معراج الکلام'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس میں چودہ مراثی شامل ہیں۔'' [۲۱]

آغا سکندر نے ''معراج الکلام'' میں شائع (۱۴) چودہ مرثیوں کے متعلق بنیادی تفصیلات (مطلع، تعداد بند، زمانہ تصنیف اور موضوع) فراہم کی ہیں اس کے علاوہ ان کے ایک اور مطبوعہ مرثیے جس کا مطلع یہ ہے۔ ''جب سے رواں ہے نثر کے قالب میں جان نظم'' کا بھی ذکر کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ ان کے مطبوعہ مرثیوں کی تعداد کم ہے اور ان کا سراغ بھی نہیں ملتا ہے۔ آغا سکندر نے مختلف حضرات کے پاس موجود غیر مطبوعہ مرثیوں کو حاصل کر کے ان کے متعلق تفصیلات کو بھی اپنی کتاب میں جگہ دی ہے۔ ان غیر مطبوعہ مرثیوں کی تعداد آٹھ (۸) ہے۔ [۲۲]

آخری مجلس:

آخری عمر میں مرزا اوج کی صحت برقرار نہ رہی تھی۔ مگر خراب طبیعت کے باوجود وہ مجالس پڑھتے رہے اور مجالس میں ایسا سماں باندھتے کہ لوگ پہلو بدلنا بھول جاتے اور بین کے اوقات میں رو رو کے نڈھال ہوتے بلکہ کچھ لوگ بے ہوش ہو جاتے۔ مصائب اہلبیت پر افراد تو کیا در و دیوار بھی گریہ کناں ہوتے۔ لیکن رفتہ رفتہ طبیعت خراب ہوتی چلی گئی اور آخر کانپور میں اپنی آخری مجلس پڑھی۔ کانپور کی اس آخری مجلس کے بارے میں آغا سکندر نے سید سرفراز حسین خبیرؔ کے حوالے سے لکھا:

''وہ مجلس بھی خوب ہوئی اس کے بعد مرزا اوج کو کوئی مجلس پڑھنا نصیب نہ ہوئی۔''۲۳

آخری وقت میں جو اشعار لکھے، وہ یہ ہیں:

پختہ امید خام ہونے آئی | عمر ہستی تمام ہونے آئی
خواب غفلت سے تو نہ چونکا اے اوجؔ | صبح پیری کی شام ہونے آئی

بیماری اور وفات:

کانپور کی آخری مجلس کے بعد بیماری نے ضعف کو اس قدر بڑھا دیا کہ انھیں بستر سے اٹھنے نہ دیا۔

آغا سکندر لکھتے ہیں کہ مرزا اوج کی عمر جب ۶۰ سال سے بڑھ گئی تو اکثر علیل رہتے۔ آخر کار آخری عمر میں وہ اسہال کبدی اور استسقاء جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہوئے۔ علاج کے باوجود مرض بڑھتا رہا، غذا ترک ہو گئی اور ایک سال مختلف قسم کی تکالیف برداشت کرنے کے بعد ۱۸۔ اپریل ۱۹۱۷ء/ ۲۵ جمادی الثانی ۱۳۳۵ھ بروز چہار شنبہ بوقت ۵ بجے شام داعی اجل کو لبیک کہا۔

مرزا اوج نے بالکل قریب مرگ وصیت نامہ لکھا کہ انہیں گھر ہی میں غسل دیا جائے، گھر میں دفن کیا جائے، مراسم کہنہ موقوف کیے جائیں، ابھی لکھ رہے تھے کہ موت نے قلم روک دیا۔۲۴

وفات کے بعد:

آغا سکندر لکھتے ہیں کہ مرزا اوج کے وفات کی خبر جنگل میں آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ ہر شخص مغموم ومحزوں نظر آ رہا تھا۔ چاروں طرف اداسی تھی۔ ہر سوگوار مرزا اوج کے جنازے کو کندھا دینے کا متمنی تھا۔ وصیت کے مطابق رات دس بجے مرزا اوج کو ان کے والد مرزا دبیر کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اخباروں، رسالوں اور مرزا کے چہلم کی مجلس میں عقیدت مندوں اور مداحوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ مرزا طاہر رفیع کے پاس سینکڑوں تعزیتی خطوط پہنچے جس سے عوام کے دکھ اور مرزا اوج سے ان کی محبت وعقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۱۷ء کو اکرام اللہ خاں کے امام باڑے میں مرزا اوج کی مجلس چہلم منعقد ہوئی۔ کثیر تعداد میں لوگوں نے

شرکت کی، آپ کی وفات پر قطعات تاریخ وفات بھی لکھے گئے۔۲۵

مرزا اوج جس خاندانی اور ادبی روایت کے امین تھے۔ اس کا خاتمہ انہی کی ذات پر ہو گیا۔ ان کی وفات سے اردو مرثیہ نگاری میں ایک عظیم خلا پیدا ہو گیا جو پھر کوئی دوسرا پورا نہ کر سکا۔ ذاکر حسین فاروقی نے پیارے صاحب رشید کا ایک یادگار جملہ دبستان دبیر میں نقل کیا۔ لکھتے ہیں۔

> ''مرزا اوج کی مجلس چہلم میں پیارے صاحب رشید نے مرزا محمد طاہر رفیع کو گلے لگا۔ یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا کہ۔ ''میاں اب فن اٹھ گیا'' ۲۶

پیارے صاحب رشید جیسے کامل فن اور استاد شاعر کے یہ لفظ مرزا اوج کی فنی اور فکری بلندی کا اعتراف اور ان کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ہے۔

فکر و فن:

مرزا اوج، مرزا دبیر کے فرزند ارجمند اور مرثیہ گوئی میں ان کی روایات کے امین ہیں۔ ان کی شاعری میں جہاں روایت پرستی کا عنصر نمایاں ہے وہاں انھوں نے چند نئے مضامین کو مرثیے میں جگہ دے کر مرثیے کی تاریخ میں ہونے والی تبدیلی کا پہلا واضح آغاز کر دیا۔ لیکن ان تبدیلیوں کے باوجود ان کے کلام میں مرثیہ کا اہم ترین عنصر ''مرثیت'' مجروح نہ ہوا۔ ان کا نام جہاں قدیم مرثیہ نگاروں کی صف میں آتا ہے وہاں وہ جدید مرثیہ نگاروں کے سرخیل بھی گنے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نیر مسعود'' مرزا جعفر اوج لکھنوی '' کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''مرزا اوج کی شخصیت کا اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنا شمار اگلے وقتوں کے لوگوں میں نہیں ہونے دیا بلکہ بدلتے وقت اور بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں پر گہری نظر رکھی''۔۲۷

عبدالروف عروج کی رائے مرزا اوج کے بارے میں مختصر ہے مگر یہ رائے کئی حوالوں سے اہم ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مرثیہ میں انھوں نے دبیر کی روایتوں کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ پوری جامعیت کے ساتھ حقیقت کے قریب بھی کر دیا۔ ان کے یہاں دبیر کی سی بلند آہنگی نہیں ملتی ہے لیکن ان کا لب ولہجہ، انداز بیان سب کچھ دبیر کا سا ہے۔............ انیس کو ایک ہی موضوع کو مختلف جزئیات کے ساتھ الگ الگ بیان کرنے میں کمال تھا۔ اس کی مثال ان کے معاصرین میں ملتی ہے نہ ان کے متقدمین میں۔ ان کی شہرت محدود ہونے میں ان کی قناعت پسندی کو زیادہ دخل ہے۔۲۸

مرزا اوج کے مرثیوں کے بارے میں ذاکر حسین فاروقی نے تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے لکھا کہ مرزا اوج کے کلام پر فطری شاعری کے علاوہ مرزا دبیر کی تربیت کے آثار بھی نمایاں نظر آتے ہیں لیکن ان کے کلام میں مرزا

دبیر کے ساتھ ساتھ مرزا انیس کا عکس بھی چھلکتا ہے۔ ان تمام اثرات کے باوجود ان کا کلام ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بہترین مظہر ہے جہاں صرف تقلید نہیں ہے بلکہ انہوں نے گذشتہ مخصوص روش سے ہٹ کر چند ایک نئی تبدیلیوں سے اپنے مرثیے کو ہمکنار کیا۔

جن تبدیلیوں کا ذکر فاروقی صاحب نے کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ مرزا اوج نے تغزل کی روش کو ناپسندیدہ قرار دیا اور مرثیہ کے قواعد کو برتنے پر زور دیا۔ اسی سبب سے مرثیے میں ساقی نامہ اور بہار نامہ کی تبدیلی کو قبول کرنے سے خود بھی انکار کیا اور اپنے شاگردوں کو بھی اس سے روکا۔

۲۔ اپنے مرثیوں میں فکر اور فلسفہ کو شامل کیا۔

۳۔ مرثیہ میں قومی اصلاح اور تعمیری مضامین کو داخل کیا۔

۴۔ مرثیے کو تاریخ سے ہم آہنگ کرنے کے لئے غلط اور غیر مستند روایات کے استعمال کرنے کی مخالفت کی۔

۵۔ جن تاریخی واقعات کو ان سے پہلے کے مرثیہ نگاروں نے نظر انداز کیا۔ انھیں مرزا اوج نے اور ان کے شاگردوں نے بھی مرثیے میں شامل کیا۔

۶۔ مرثیے کے فن اور قواعد کی پابندی پر بہت زور دیا۔ ان سے پہلے ایطا، شتر گربہ، تنافر الفاظ اور حروف کا گرنا، مرثیے میں جائز تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن مرزا اوج نے ان تمام فنی اسقام کو دور کرنے پر زور دیا۔۲۹

ذاکر حسین فاروقی نے مرزا اوج کے مرثیوں کو مختصر طور پر تین ادوار میں تقسیم کر کے ان کے بنیادی فرق کی وضاحت بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''مرزا اوج کے ابتدائی اور وسطی عمر کے مراثی میں بڑی شگفتگی، رنگینی اور مضمون آفرینی پائی جاتی ہے۔ تشبیہات و استعارات کی وہی کثرت، وہی شکوہ و طنطنہ، وہی خیال بندیاں اور تخیل کی وہی عرش پیمائیاں جو مرزا دبیر کا طرہ امتیاز ہیں اوج کے کلام میں بھی نظر آتی ہیں۔ لیکن اواخر عمر میں ان کا رنگ سخن بدل گیا۔ آخری عمر کے مراثی میں ہم دیکھتے ہیں کہ رخصت ایک یا دو بند میں ختم ہو جاتی ہے، سراپا کے بجائے سیرت کا ذکر ہوتا ہے، تلوار اور گھوڑے کی تعریف بھی محض چند بندوں میں ختم کر دی جاتی ہے، چہرہ میں فلسفہ دین، اخلاقیات یا فلسفہ شہادت پر بحث، ملت کی بدحالی کا شکوہ یا تعمیر ملی پر زور اور آخر میں قیامت کے مبکی بند شامل کر کے مرثیہ ختم کر دیا جاتا ہے۔............آخر عمر میں انھوں نے مختصر مراثی کہنا شروع کر دیے............ان کے آخری عمر کے مراثی نہایت دل دوز، جگر خراش، اشک آفرین اور درد انگیز ہیں اور ان مراثی سے ہماری زبان کی الم نگاری اور جذبات آفرینی کی صلاحیتیں پوری شدت سے واضح ہوتی ہیں۔''۳۰

اوج پر دیگر مرثیہ گویوں کے اثرات:

سید صفدر حسین نے مرزا اوج کے کلام کے مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات کے بیان سے متعلق ''سبع مثانی'' کی رائے پر بھروسہ کیا اور اس کو آگے بڑھایا۔ انھوں نے لکھا کہ:

> ''ابتدائی عمر میں ان پر پوری طرح سے دبیریت مسلط تھی لیکن رفتہ رفتہ زمانے کا مذاق مجبور کر کے انہیں انیسیت کی طرف لے آیا۔ پھر بھی پچھلی فضاؤں میں بسا ہوا دماغ آسانی سے خالی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کشمکش میں وہ ایک کنارے پر آ لگے جس میں انیس کی لطافت خیال تھی اور تراکیب و بندش اور بیشتر تشبیہات و استعارات میں وہی مرزا دبیر کا انداز تھا۔''[۳۱]

ذاکر فاروقی نے آخری دور کی شاعری میں چند نمایاں تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کی رائے کے مطابق آخری دور کی شاعری میں انفرادیت کا عنصر واضح ہے۔ جس میں انھوں نے اپنا انداز متعارف کروایا۔ جو گذشتہ انداز سے مختلف تھا۔ لہٰذا مرزا اوج کو صرف انیس اور دبیر کے اثرات کے تحت بیان کرنے کے علاوہ ان کی دیگر انفرادی خصوصیات کا مطالعہ بھی نہایت ضروری ہے۔

آغا سکندر مہدی نے مختلف اشعار کی مدد سے مرزا اوج کے کلام کی خصوصیات کو ابھارنے کی کوشش کی۔ ان کے مطابق مرزا اوج کے کلام میں تصنع کے بجائے سادگی کا تاثر زیادہ ملتا ہے، ان کی شاعری نے یہ ثابت کر دیا کہ اگر اعلیٰ مضمون ہو تو سادگی بھی کمال شاعری بن جاتی ہے۔ مرزا اوج کے مرثیوں میں کہ انیس کے رنگ کے ساتھ دبیر کا رنگ اور پھر مرزا اوج کی اپنی انفرادیت بھی نمایاں نظر آتی ہے آغا سکندر لکھتے ہیں:

> ''ان مثالوں سے یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ مرزا اوج میر انیس کے کس قدر قریب ہیں اور ان کے رنگ کو کتنی خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا............رنگ انیس سے متاثر ہونے کے باوجود بھی ان کا اپنا ایک الگ رنگ تھا جس میں انھوں نے ثقیل اور ادق الفاظ کا استعمال جا بجا بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔''[۳۲]

سماجی شعور:

آغا سکندر نے لکھا کہ مرزا اوج سماج اور معاشرے کے بدلتے معیارات سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے اپنے مرثیے کو بھی سماجی شعور کا ذریعہ بنایا اور معاشرے کی غلط باتوں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ مثال کے طور پر پنڈراول کی مجلس میں علی گڑھ کے دو سو طلبا نے شرکت کی۔ وہاں پڑھے گئے مرثیے میں، مرزا اوج نے بڑے ڈھنگ سے نئے زمانے کی شکایت کی۔ یہ بات طلبا کو ناگوار گزری۔ وہ سمجھے کہ شاید ان پر تنقید ہو رہی ہے۔ مگر غور کرنے پر انھیں اندازہ ہوا کہ یہ چوٹ کسی ایک فرد یا طبقے پر نہیں بلکہ یہ نئی روش سے متاثر ہر ابنائے جنس کی شکایت ہے۔ یہاں تک کے مرثیہ نگار بھی اس تنقید کی زد میں تھے۔ طلبا نے مرزا اوج سے ملاقات کی، مرزا اوج نے ان کے استفسار پر انہیں

بتایا کہ:

''دُنیا میں کسی قوم نے ترقی نہیں کی جب تک تمام علوم اپنی زبان میں ترجمہ نہیں کر لئے۔'' ۳۳

اس بات سے علم ہوتا ہے کہ مرزا اوج عصری حالات کو گہرے غور وفکر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، صرف ان کی تنقید کو کافی نہ سمجھتے بلکہ ان حالات کو سدھارنے کے لئے ان کے پاس حل بھی موجود تھا۔ مرثیہ کو عہد حاضر کے تقاضوں اور مسائل سے ہم آہنگ کر کے انھوں نے ایک نئی طرز کی بنا ڈالی جس نے آگے چل کر باقاعدہ صورت اختیار کر لی۔

مرزا امیر علی جونپوری نے جو کچھ مرزا اوج کے بارے میں لکھا ہے وہ گذشتہ معلومات کا ہی اعادہ ہے۔

طاہر حسین کاظمی نے بھی کم وبیش گذشتہ محاسن کلام کا ذکر اپنی کتاب میں کیا۔ مرزا اوج کے مرثیوں میں سماجی تنقید اور دیگر خصوصیات کے حوالے سے ان کی رائے ملاحظہ فرمایئے:

''اوج نے مرثیہ کو سماجی تنقید سے بھی روشناس کیا۔ اپنے زمانے کے مسائل اور اخلاقی پہلوؤں کو مرثیوں میں جگہ دی۔ اس لحاظ سے ان کا پیغام کسی مخصوص طبقے یا عقیدے کے لئے نہیں بلکہ عام انسانیت کے لئے ہے۔ دنیا کی بے ثباتی، مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب، طلبا اور نوجوانوں میں احساس فرض شناسی اور تہذیب و ہنر کو اپنے مرثیوں میں جگہ دی جس کے بیان میں واقعہ کربلا کے کرداروں کی تقدیس کا لحاظ رکھا اور اپنے خیالات یا موضوعات کو اس حد تک حاوی نہیں ہونے دیا کہ مرثیہ کی اصل روح مجروح ہو۔'' ۳۴

ساقی نامہ:

ذاکر حسین فاروقی نے لکھا تھا کہ مرزا اوج نے ساقی نامہ اور بہار نامہ کو ناپسند کیا۔ ان کے نزدیک مرثیہ اور غزل الگ الگ صنف سخن ہیں۔ دونوں کو خلط ملط کر دینے سے مرثیے کے تاثیر متاثر ہو جائے گی۔ ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں کہ:

''ان کا کلام مرثیہ میں بڑھتے ہوئے رنگ تغزل کے خلاف ایک جہاد تھا۔ جس کے لیے انہوں نے عمر بھر خود بھی کوشش کی اور اپنے شاگردوں کو بھی یہ تلقین کرتے رہے کہ مرثیہ، مرثیہ رہے'' ۳۵

آغا صاحب نے یہ بیان کتاب کے آخر میں درج کیا ہے۔ جہاں وہ پورے مقالے کے اہم نکات کو اختصار کے ساتھ بیان کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ یا تو کتابت کی غلطی ہے۔ کیونکہ گزشتہ ابواب میں جہاں آغا صاحب نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے وہاں وہ بھی ذاکر حسین فاروقی کے ہم خیال ہیں۔

آغا صاحب نے ایک ایسی مجلس کا ذکر کیا جس میں مرثیہ گو گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں رنگ تغزل کی طرف گامزن تھے۔ آغا صاحب لکھتے ہیں کہ

''مرزا اوج اپنی ذہنیت سے مجبور تھے ان کو یہ رنگ قطعی پسند نہ آیا۔'' ۳۶

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا اوج بہاروساقی نامے کے بڑھتے ہوئے رجحان کو ناپسند کرتے تھے۔

الم نگاری یا مرثیت:

ذاکر حسین فاروقی لکھتے ہیں کہ مرزا اوج رزم نگاری میں بھی شاندار انداز اختیار کرتے ہیں مگر:

''وہ مرثیت اور گریہ خیزی کو مرثیہ کی جان تصور کرتے تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں تک خالص مرثیت کا تعلق ہے وہ ایک بہت بڑے شاعر تھے، اپنے دور کے سب سے بڑے الم نگار تھے، اور یہ وہ چیز ہے جو ان کو ان کے تمام اقران وامثال سے ممتاز کردیتی ہے۔'' ۳۷

سید صفدر حسین لکھتے ہیں:

''اگر مرثیے کا مقصد محض گریہ مجلس سمجھ لیا جائے تو اوج مرحوم کا پایہ بہت بلند نظر آتا ہے۔انھوں نے بڑے دردناک انداز سے مصائب نظم کئے ہیں۔'' ۳۸

آغا سکندر نے بھی مرزا اوج کے مرثیوں میں مرثیت کی خوبی کو بطور خاص سراہا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

''جہاں تک مرثیت کا سوال ہے مرزا اوج نے اپنے پدر بزرگوار کی طرح ان روایات کو زندہ رکھا جن سے مرثیت برقرار رہی'' ۳۹

روایت نگاری:

ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے مرزا اوج کی روایت نگاری کے حوالے سے جس بات کا ذکر دو چار سطروں میں کیا آغا مہدی نے اس کی وضاحت کافی تفصیل سے پیش کی۔انھوں نے لکھا کہ صحیح روایات نظم کرنے کے لئے انھوں نے شعوراً کوششیں کیں۔مثلاً حضرت قاسمؑ کی شادی سے متعلق روایت کا ذکر ان سے پہلے احسان، فصیح، خلیق، دبیر، انیس اور ان کے ہم عصر عارف اور کئی دیگر مرثیہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز میں روایت کو نظم کیا۔مرزا اوج نے اپنے مشہور مرثیے میں حضرت قاسمؑ کا ذکر کیا مگر ان کے ذکر عروسی سے گریز کیا۔حالانکہ یہ ذکر ان کے اس مرثیے سے قبل ان کے ایک سلام میں ملتا ہے۔یہ بات ان کے نظریاتی ارتقا اور تبدیلیوں کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔لیکن ان کی اس تبدیلی کو بقول آغا سکندر مہدی ان کے ہم عصر مرثیہ نگاروں نے قبول نہ کیا۔لکھتے ہیں:

''انھوں نے کوشش کی اور وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے ہم عصر مرثیہ گو بھی اسی راہ پر چلیں مگر ایسا نہ ہوا۔انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ مرثیہ میں صرف صحیح روایات کو ہی نظم کیا جائے۔'' ۴۰

روایت نگاری کے معاملے میں بہت کم مرثیہ نگاروں نے ان کی تقلید کی خیال کے طور پر حضرت سلطان عالم واجد علی شاہ اختر کسی حد تک ان کے ہم خیال نظر آئے۔ان اشعار سے پتا چلتا ہے کہ وہ بھی روایات کو نظم کرنے

مرزا اوج کے ہم خیال ہیں۔ مگر ان کے علاوہ ان کے چلن اور ان کے ہم عصروں کے چلن میں تضاد تھا۔
آغا سکندر لکھتے ہیں کہ:

''انھوں نے جس وقت اپنی راہ الگ کی یہ خیال ہی نہ کیا کہ اس راہ کا تعلق وادی گلشن سے ہے یا وادی پر خار سے، انھوں نے کبھی مڑ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ اس راہ میں تنہا ہیں یا کوئی رفیق ساتھ ہے۔''[۴۱]

جناب قاسمؑ کے ذکر عروسی کے علاوہ مرزا اوج نے عون و محمد کے علم والے قضیے کا واقعہ بھی قلمبند نہ کیا۔[۴۲]

ان تمام کتابوں کے مطالعے کے بعد اس بات کا علم ہوتا ہے کہ مرزا اوج کی حیات وفکر وفن کے بہت سے پہلوؤں کو بے نقاب کر دیا گیا۔ ولادت سے لے کر وفات تک، علمی استعداد سے لیکر شعر گوئی کے میدان میں ان کی اہمیت تک، مزاج و عادات، شادی، اولاد سب کا ذکر موجود ہے۔ لیکن ابھی ان کے کلام کی اشاعت کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی ان کے محاسن کلام کے دیگر گوشوں کی تفصیلی وضاحت کی ضرورت ہے۔ صنائع و بدائع، سیرت نگاری، کردار نگاری، نفسیات نگاری، منظر نگاری اور ایسے دیگر بہت سے اوصاف ابھی پردہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ اپنے عہد کے دیگر شعرا کے کلام سے موازنہ، ان کی حیثیت اور مرتبے کا تعین، اور آج تک کے مرثیوں پر مرزا اوج کے کلام کے اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

مرزا اوج کے تلامذہ کے حوالے سے دو کتابوں میں تفصیلی ذکر موجود ہے۔ اول'' دبستان دبیر '' اور دوم'' مرزا محمد اوج جعفر لکھنوی ''۔ آغا سکندر نے اعتراف کیا ہے کہ اکثر شعراء کے حالات لکھنے میں انہوں نے دبستان دبیر سے مدد لی ہے جبکہ چند ایک ایسے مرثیہ گو ہیں کہ جن کے حالات لکھنے میں انہوں نے مزید تحقیق سے اضافہ کیا ہے۔ مختصر یہ کہ مرزا اوج محض مرثیہ نگار نہیں، مرثیہ گویوں کے میر کارواں بھی ہیں۔ ضیا لکھنوی نے اپنی مثنوی '' آئینہ اخلاص '' میں اوج کی تعریف کچھ یوں کی کہ:

جناب اوج ملک قدر نور چشم دبیر — محال جن کا آفاق میں عدیل و نظیر
ہمیشہ لکھنؤ سے آتے ہیں وہ باتوقیر — ہمیشہ ہوتا ہے مجلس میں ان کی جم غفیر
سخن کے مرتبے ان کے سخن سے بڑھتے ہیں
پسند خلق ہے، یوں مدح شاہ پڑھتے ہیں[۴۳]

حواشی و حوالہ جات:

۱۔ ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر، دبستان دبیر (بار اوّل) لکھنو: نسیم بک ڈپو، مئی ۱۹۶۶ء) ص ۱۷۲

۲۔ مرزا سید سکندر آغا، مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی، حیات اور ادبی کارنامے، (لکھنو: نظامی پریس، ۱۹۸۵ء) ص ۱۷

۳۔ ایضاً،ص ۴۳

۴۔ ایضاً،ص ۴۳

۵۔ مرزا سید سکندر آغا، مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی، حیات اور ادبی کارنامے ص ۵۴۳

۶۔ سید عاشور کاظمی، اردو مرثیے کا سفر (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء) ص ۱۶۳

۷۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب، انیسیات مرتب: صباح الدین عمر، (بار اوّل) (نئی دہلی: پرنس آرٹ پرنٹرز، ۲۰۰۲ء) ص ۳۷

۸۔ لالا سری رام بحوالہ: سکندر آغا، سید، ڈاکٹر، مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی، ص ۷۷

۹۔ سید آغا مہدی، تاریخ لکھنو، (کراچی: جمیعت خدام عزا، س ن) ص ۳۰۴

۱۰۔ ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر، دبستان دبیر ص ۱۸۲

۱۱۔ عبدالروف عروج، اردو مرثیہ کے پانچ سو سال (کراچی: شارق پبلیکیشنز، س ن) ص ۴۸

۱۲۔ سید عاشور کاظمی، اردو مرثیے کا سفر، ص ۱۶۵

۱۳۔ ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر، دبستان دبیر، ص ۱۷۶

۱۴۔ مرزا سید سکندر آغا، مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی، حیات اور ادبی کارنامے، ص ۷۰

۱۵۔ ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر، دبستان دبیر، ص ۹۰، ۹۱

۱۶۔ افضل حسین ثابت لکھنوی، بحوالہ: مرزا سید سکندر آغا، مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی، حیات اور ادبی کارنامے، ص ۹۹

۱۷۔ مرزا سید سکندر آغا، مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی، حیات اور ادبی کارنامے، ص ۹۴

۱۸۔ ایضاً، ص ۹۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۹۰

۲۰۔ ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر، دبستان دبیر، ص ۲۰۰

۲۱۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین، مرثیہ بعد انیس (لاہور: سنگ میل پبلیکیشنز، ۱۹۷۱ء) ص ۱۲۸

۲۲۔ مرزا سید سکندر آغا، مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی، حیات اور ادبی کارنامے، ص ۱۳۰ تا ۱۳۹

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۰۵

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۱۹

۲۶۔ ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر، دبستان دبیر، ص ۱۷۶

٢٧۔ مرزا سید سکندر آغا، مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی ، حیات اور ادبی کارنامے، ص٩،١٠

٢٨۔ عبدالروف عروج، اردو مرثیہ کے پانچ سو سال، ص٤٨

٢٩۔ ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر، دبستان دبیر، ص١٧٧ تا ١٧٩

٣٠۔ ایضاً، ص١٩٧ تا ١٩٩

٣١۔ صفدر حسین سید، ڈاکٹر، مرثیہ بعد انیس، ص١٢٨، ١٢٩

٣٢۔ سکندر آغا، سید، ڈاکٹر، مرز امحمد جعفر اوج لکھنوی، ص١٦٤

٣٣۔ ایضاً، ص١٠٥

٣٤۔ طاہر حسین کاظمی، ڈاکٹر، سید، اردو مرثیہ میر انیس کے بعد (دہلی: ایرانین آرٹ پرنٹر، ١٩٩٧ء) ص٣٢

٣٥۔ ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر، دبستان دبیر، ص١٧٨

٣٦۔ مرزا سید سکندر آغا، مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی ، حیات اور ادبی کارنامے، ص١٤٨

٣٧۔ ذاکر حسین فاروقی، ڈاکٹر، دبستان دبیر، ص١٩٩

٣٨۔ ڈاکٹر سید صفدر حسین، مرثیہ بعد انیس، ص١٣٤

٣٩۔ مرزا سید سکندر آغا، مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی ، حیات اور ادبی کارنامے، ص١٦٦

٤٠۔ ایضاً، ص١٤٨

٤١۔ ایضاً، ص١٤٩

٤٢۔ ایضاً، ص١٥٧

٤٣۔ رشید موسوی، ڈاکٹر، دکن میں مرثیہ اور عزاء داری (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ١٩٨٩ء) ص ١٣٥

مآخذ:

١۔ ادیب، مسعود حسن رضوی، سید، انیسیات مرتب صباح الدین عمر، (باراوّل) نئی دہلی: پرنس آرٹ پنٹرس، ٢٠٠٢ء۔

٢۔ رشید موسوی، ڈاکٹر، دکن میں مرثیہ اور عزاء داری، نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، ١٩٨٩ء۔

٣۔ سکندر آغا، مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی ، حیات اور ادبی کارنامے لکھنو: ناشر مصنف، نظامی پریس، ١٩٨٥ء۔

۴۔ صفدر حسین، سید، ڈاکٹر، مرثیہ بعد انیس، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۱ء۔
۵۔ عروج، عبدالروف، اردو مرثیہ کے پانچ سو سال، کراچی: شارق پبلی کیشنز، س ن۔
۶۔ فاروقی، ذاکر حسین،، ڈاکٹر، دبستان دبیر (باراوّل) لکھنو: نسیم بک ڈپو، مئی ۱۹۶۶ء۔
۷۔ کاظمی، طاہر حسین، سید، ڈاکٹر، اردو مرثیہ میر انیس کے بعد ، دہلی: ایرانین آرٹ پرنٹر، ۱۹۹۷ء۔
۸۔ کاظمی، عاشور، سید، اردو مرثیے کا سفر، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء۔
۹۔ مہدی، آغا سید ، تاریخ لکھنو، کراچی: جمیعت خدام عزا، س ن۔

☆☆☆